دین ودانش

فکرو استدلال
کے تین اصول

مولانا محمد حنیف ندوی

(دعوت و تبلیغ دین کے سلسلہ میں ایک بصیرت افروز تحریر)

زیر نظر مضمون دراصل مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ کی کتاب "مرزائیت نئے زاویوں سے" کا ایک باب ہے۔ یہ کتاب ایک عرصہ سے نایاب ہے۔ اس کی اہمیت وافادیت کیلئے خود مولانا مرحوم کی علمی شخصیت کا حوالہ کافی ہے قارئین کے مطالعہ کے لئے یہ تحریر شائع کی جارہی ہے۔ ان شاءاللہ عنقریب مکمل کتاب بھی طبع کر کے قارئین کی خدمت میں پیش کردی جائے گی۔

نئی بات کہنا مشکل ہے:

جہاں تک نفس دلائل کا تعلق ہے صرف دلائل ہی سب کچھ نہیں ہوتے بعض اوقات ان کو قرینے سے پیش کرنا زیادہ اہمت رکھتا ہے۔ ایک ہی حقیقت باوجود بار بار زیر نظر ہونے کے بسا اوقات ذہن سے اوجھل رہتی ہے اور پھر سلیقے کے ایک ہی اشارہ سے سہو و مدہوشی کا سارا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔

قرآن حکیم کے دلائل پر کبھی لکھنے کا موقع ملا تو اس کی اس خوبی پر کھل پر بحث کی جاسکے گی کہ آیات وشواہد کے پیش کرنے میں یہ کن کن اداؤں میں دوسروں سے ممتاز ہے۔ یہاں صرف اتنا دیاد رکھئے کہ وہ کوئی انوکھی اور جدید بات لے کر نہیں آیا نئے نئے دلائل کی خلاقی و تکوین اس کا ہرگز منصب نہیں وہ تو انہیں حقیقتوں کو جو ہمارے گردو پیش پھیلی ہوتی ہیں اور جن پر کبھی نگاہ اعتبار نہیں پڑتی اور اگر پڑتی ہے تو غوروفکر کے لئے نہیں رکتی اس ڈھنگ سے پیش کرتا ہے کہ ذہن کی تمام صلاحتیں خود بخود انہیں حقیقتوں پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔ اور اس کے سوا اور کوئی چارہ کار ان کیلئے نہیں رہتا کہ یا تو ایک دم جھٹلائیں اور یا پھر ان کی تصدیق کریں یہ انداز اور یہ ڈھب حقیقی شے ہے

بیچ کے کچھ زینے:

یوں سمجھئے کہ فکر سے پہلے اصابت فکر کا مرتبہ ہے سوچنا اور بات ہے اور صحیح سوچنا اور بات!

بسا اوقات ایک مسئلہ پر ہم گھنٹوں بحث کرتے ہیں علم منطق کے تمام حربے استعمال میں لاتے ہیں اور پھر بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے لیکن جب ایک بارگی خود حقیقت ایک دوسرے انداز میں ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے تو ہمیں اپنی بیچارگی و جہل پر افسوس ہوتا ہے کہ یہی بات تو ہزار دفعہ دوران بحث و مناظرہ میں دلائل و

اعتراضات کی شکل میں ہمارے سامنے آئی لیکن دل میں نہ اُتر سکی۔ اب یہ کیا معاملہ ہے کہ یہی چھوٹی سی اور نہایت پیش پا افتادہ حقیقت ہماری آنکھیں کھول دینے کے لئے دل کی طرف بے اختیار بڑھ رہی ہے۔

بات یہ ہے کہ السانی ذہن تک اُترنے کے لئے بیچ کے کچھ زینے ہیں ان کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ذہن صاف ہے۔ دلائل میں کوئی الجھاؤ نہیں اور پیش کرنے کا ڈھنگ منطقی طور پر استوار ہے۔ تو بات سنوانے میں ایک منٹ کی تاخیر نہیں ہوگی۔

تاخیر و التواء یا ڈھیل کے تین ہی سبب ہوسکتے ہیں۔ یا تو جو بات آپ کہتے ہیں وہ مبنی بر حقیقت نہیں۔ یا پھر سننے والے کا ذہن صاف اور اخاذ نہیں۔ یا پھر مسئلہ کو پیش کرنے کا ڈھنگ صحیح نہیں۔

کہنے کا ڈھنگ:

اس تیسری بات کو میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک کہنے کا اسلوب زیادہ درخور اعتنا ہونا چاہئے۔ با رہا ایسا ہوا ہے۔ کہ ذہن کی کجی اور غیر استواری کے باوجود جب کوئی بات ڈھب کی کی گئی تو اس نے دل میں کہیں نہ کہیں جگہ پیدا کر ہی لی۔

ڈھنگ سے کیا مقصود ہے؟:

ڈھنگ سے کہنے سے مقصود صرف لفاظی نہیں یا فصاحت و بلاغت نہیں کہ اس کا مرتبہ بعد کا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ جس مسئلہ کو آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے آپ یہ دیکھ لیں کہ خود اس کا مرتبہ کیا ہے۔ یعنی یہ فکری واستواری کے کس درجہ میں ہے۔ اس کے بعد اس پر غور فرمائیے کہ اب تک جو اسے پیش کیا گیا ہے تو اس میں کن باریک علمی رعایتوں کو نظر انداز کر دینے سے اس کی مؤثریت میں فرق آیا ہے؟ کیا نفسیاتی یا منطقی نقائص ہیں جن کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوتی رہی۔ اس کے بعد بھی اگر خصم نہیں مانتا۔ تو پھر آپ کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ پھر آپ کے پاس یہ معقول عذر ہے کہ ممکن حد تک آپ کوشش فرما چکے۔ مقدر کی خرابیاں آپ کے بس کا روگ نہیں۔ پانی میں سیدھی سے سیدھی شے بھی ٹیڑھی نظر آئے گی۔ فطرت کا بدلنا ہمارے لئے دشوار ہے۔

فکر و استدلال کے تین اصول:

ہم نے جہاں تک غور کیا ہے، یہاں پر تین مقدمات ایسے ہیں جن کی وضاحت ہو جانا چاہئے۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ یہ تین اصول ہیں جن کو بہر آئینہ ہر بحث میں مرعی رہنا چاہئے۔ ہم نے تمام اختلافی مسائل پر غور کیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں۔ کہ فکر و استدلال میں جہاں کہیں فروگذاشت ہوتی ہے وہ انہیں تین حقیقتوں کو نظر انداز کر دینے سے ہوتی ہے۔ یعنی ان تین مقدمات کا درجہ یہ ہے کہ کہ ان پر غور و فکر کر لینے سے ہر ہر مسئلہ میں آپ کا راستہ ہموار ہو جاتا ہے اور اس کی مدد سے آپ فوراً معلوم کر سکتے ہیں کہ استدلال کے اشہب تیز خرام نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان میں ایک حقیقت نفسیاتی مزاج کی ہے اور دوسری دو منطقی انداز کی

مناظرانہ ذہنیت:

پہلے نفسیاتی حقیقت کو لیجئے۔ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت یہ نہایت ضروری ہے کہ ذہن پر مناظرانہ کیفیتیں

اثر انداز نہ ہوں یعنی آپ بحث کے موڈ میں نہ ہوں کہ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ نظر و فکر میں وہ کلیت و جامعیت پیدا ہو سکے جو دین کے اسرار تک انسان کو پہنچاتی ہے

مناظر میں سب سے بڑا نقص جو پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ باوجود ذہانت اور جودت طبع کے کبھی اس لائق نہیں ہو پاتا کہ دین کے مزاج ہی پر غور کر سکے دین کے مصالح پر نظر ڈال سکے کہ اس کے اصول و بنیادی تقاضے کیا ہیں اس کے الہیات، اخلاق، عبادات اور معاشرتی و اقتصادی نقشے انسان کو کس منزل کی طرف لے جاتے ہیں اس کے ماننے سے کس نوع کا طبقہ ظہور پذیر ہوتا ہے؟ کس طرح کے اخلاق سے انسان آراستہ ہوتا ہے اور عادات و عقائد میں کیا تغیر رونما ہوتا ہے؟ وہ کیا سلجھاؤ اور شائستگی ہے اس کا مایۂ افتخار و نازش ہے؟ یعنی مذہب کا وہ جمال اور حسن جو اس کی بنیاد اور اساس ہے۔ مناظر کی نظر سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کی نظر میں ایک طرح کی ٹیڑھ اور کجی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے سبب سے جزئیات کی ٹٹول اور جستجو میں لگا رہتا ہے اور اصول کی نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ اسکی ساری پرچول شاخوں اور پتیوں تک ہی رہتی ہے۔ اور اس تعمق و تفحص کی مناظرانہ موشگافیوں میں اسے موقع ہی نہیں ملتا کہ اس کے اس جمال سے لطف اندوز ہو سکے۔ جس کا تعلق پورے درخت کے پھیلاؤ سے ہے۔ گویا یہ پیڑ گننے کا قائل ہے آم کھانا اس کے مقاصد میں داخل نہیں۔

اس کا نتیجہ:

اس ذہنیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ نظر کی جزئیت کی وجہ سے اسلام پر جب غور کرے گا تو جزئی حیثیت سے، اگر وہ معتزلی ہے۔ تو یہ دیکھے گا کہ کن کن آیات سے اعتزال کی تائید ہوتی ہے۔ ارجاء کا قائل ہے تو ہزار زور اس پر لگائے گا کہ ارجاء کی آیات تلاش کی جائیں۔ اس طرح جبری یا قدری ہے تو اپنے ڈھب کی آئتیں دکھلائے گا۔ اس کو اس سے کچھ مطلب نہیں ہوگا کہ اسلام بحیثیت مجموعی ہم سے کیا چاہتا ہے؟ انہوں نے دوران مطالعہ میں یہ کوفت محسوس کی ہوگی کہ اس طرح کی بحثوں نے کیونکر قرآن کی حقیقی معنویت اور خوبیوں کو چھپا رکھا ہے۔ بہت بڑا نقصان اسلام کو یہ پہنچا ہے کہ اس کے حکم و اسرار چند لاطائل بحثوں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اتنی جلیل القدر کتاب صرف مناظرانہ گتھیوں کو سلجھانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔ انسانی زندگی کو سنوارنا اس کا مقصد نہیں۔

اس کا اثر اعمال پر کیا ہوتا ہے؟:

عملی اعتبار سے اس کا اثر طبائع پر یہ ہوتا ہے کہ مذہب کے تقاضے صرف اس قدر رہ جاتے ہیں کہ مخصوص مسائل پر آپ کے ذہن میں کتنا مواد جمع ہے؟ اور کن کن دلائل سے آپ اپنے مسلک کو حق بجانب ٹھہرا سکتے ہیں؟ مذہب کی روح سے استفادہ پوری عملی زندگی میں اس سے رہنمائی کا ولولہ اور شوق یا اخلاق و عادات میں ایک خاص طرح کا امتیاز قائم رکھنے کی تڑپ دائرہ عمل سے خارج قرار پاتی ہے۔

یعنی ایک مناظر اگر وہ مرزائی ہے تو اس کی تمام تر مذہبی زندگی کا مدار اس پر ہوگا کہ وہ حیات مسیح کے مسئلہ پر بڑے سے بڑے عالم سے ٹکرا سکے۔ ختم نبوت سے مضبوط حصار کو توڑ سکے۔ مرزا صاحب کی کبھی نہ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو ایسی ترازو پر تول سکے جس سے یہ معلوم ہو کہ یا تو تمام پہلے انبیاء معاذاللہ اسی طرح کی مہمل اور متضاد

باتیں کرتے رہے ہیں اور یا پھر پیشین گوئی چیز ہی ایسی ہے کہ اس کے ٹھیک ٹھیک منشا تک رسائی ناممکن ہے۔ پھر اگر یہ منشا اس کے زعم کے مطابق پورا ہو جاتا ہے۔ تو اس کی نفسیات مذہبی کی تسکین ہو جاتی ہے وہ اب اس کا ہرگز مکلف نہیں ہے کہ مذہب کے اصولی و اساسی تقاضوں پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ بات صرف مرزائی مناظر ہی سے مخصوص نہیں۔ دینی تصور کا یہ بگاڑ ہر اس شخص میں پیدا ہو جاتا ہے جو اس ذہن کا حامل ہے۔ یعنی بحث و جدل کی اہمیت اس گروہ میں اس درجہ محسوس کی جاتی ہے کہ اسی کو حاصلِ دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر آپ نزاعی مسائل پر ان کے انداز اور اسلوب پر نہیں سوچتے تو یہ کبھی آپ کی اصابت رائے کے قائل نہیں ہو سکیں گے۔

ایک مناظر کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت اس کی تمام متعلقہ تفصیلات پر سوچ بچار کی کبھی زحمت گوارا نہیں کرے گا بلکہ اس کا انداز یہ ہوگا کہ یہ ایک آیت یا ایک حدیث جس کو دیکھے گا۔ کہ اس کے مقصد کو کسی حد تک پورا کر سکتی ہے اسے مضبوطی سے پکڑ لیگا۔ اور کوشش کریگا کہ یہیں کھونٹا گاڑ کر بیٹھ جائے۔ اب نہ تو وہ خود یہاں سے ہلے گا اور نہ آپ کو ہلنے دیگا۔ اس کی یہ خواہش ہو گی کہ اسی ایک آیت یا حدیث سے وہ تمام تفصیلات جو مطلوب ہیں نکل آئیں۔

حالانکہ قرآن یا سنت کا یہ انداز نہیں بلکہ ہر ہر مسئلہ کے لئے وضاحت و تفصیل کا یہاں ایک مقام ہوتا ہے۔ اور قرآن و حدیث میں کسی مسئلہ کے تفحص کے لئے یہ ضروری ہے کہ اسی مقام پر نظر ڈالی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ اس خصوص میں ہمیں کتاب و سنت کے سرچشموں سے کیا ملتا ہے۔

کیا مناظرہ جنگ ہے؟:

دلائل و براہین کی نمائش اور بات ہے۔ اور حقیقت تک رسائی بالکل دوسری شئے۔ جن لوگوں نے مناظروں کو دیکھا ہے۔ اور سنا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ فریقین کس طرح بحث میں ایک دوسرے کو الجھاتے ہیں حیرت و پریشانی کے کیا کیا سامان پیدا کئے جاتے ہیں۔ اور کس کس انداز میں مخالف کی سادگی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ کس کس طرح غلط بیانی کی جاتی ہے؟ اور اسے "الحرب خدعۃ" سمجھ کر جائز ٹھہرایا جاتا ہے۔

حالانکہ یہ سرے سے حرب ہی نہیں، یہاں تو غرض افہام و تفہیم ہے۔ یعنی اپنی بات سمجھانا اور دوسرے کی سمجھنا مقصود ہے۔ لیکن وہ اس اعتبار سے اسے حرب کہنے میں حق بجانب ہیں کہ فریقین کی نفسیات مناظرہ میں واقعی اس طرح کی ہو جاتی ہیں۔ گویا باہم خصم اور مخالف ہیں۔ منشاء ایک دوسرے کو پچھاڑنا ہے اور شکست دینا ہے۔ سمجھنا نہیں۔

مناظرہ اور دعوت کے تقاضے جدا جدا ہیں:

جب مناظرہ کی غرض و غایت یہ قرار پائے کہ مخالف پر کیونکر فتح حاصل کی جا سکتی ہے۔ تو اس کا مزاج دعوت دینی کے مزاج سے بالکل مختلف ٹھہریگا کیونکہ دین تو یہ چاہتا ہے۔ کہ خطاب میں ایسی مؤثریت، ایسی

شیرینی، ایسی مٹھاس اور جاذبیت ہو کہ سننے والا اثر قبول کر کے رہے۔ اور مناظرہ کے تیور اس بات کے متقاضی ہونگے کہ اس میں جنگ کا دم خم ہو۔ جنگ کا سا ولولہ اور للکار ہو۔ اور جنگ ہی کی طرح کا انداز گفتگو ہو۔

مذہب و مناظرہ بظاہر اگرچہ حلیف و دوست معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقتہً ان کے راستے جدا جدا ہیں۔ مذہب کے معاملہ میں بسا اوقات ہار جانا فتح کا مترادف ہوتا ہے۔ اسی طرح اپنی غلطی نہ صرف یہ کہ تسلیم کرنا پڑتی ہے بلکہ غلطی پر متنبہ کرنے والے کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور مناظر ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس سے یا تو کبھی لغزش سرزد ہی نہیں ہوتی۔ اور یا پھر اس لغزش کا اخفاء ضروری ہوتا ہے۔

یہ مخالف تو داعی کی نسبت سے ہوا۔ وہ شخص جس کو آپ کسی دینی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر مناظرہ کا ڈسا ہوا نہیں ہے۔ تو نہایت توجہ سے آپ کی باتوں کو سنے گا۔ اور پوری شکر گذاری کے ساتھ ان کی پذیرائی کرے گا۔ لیکن اگر وہ ایسی طبیعت نہیں رکھتا۔ اور اس کے دل و دماغ پر بحث کا ٹھاگ چکا ہے۔ تو سمجھ لیجئے کہ دل کی صحت رخصت ہو چکی۔ وہ آسانی سے ماننے والا نہیں۔ بات بات پر یہ کوسے گا۔ اور ایسی مین میخ نکالے گا کہ آپ پریشان ہو جائیں گے۔

مناظرہ اور تبادل خیال میں فرق:

اس غلط فہمی کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ کہ تبادل خیالات کو ہم مناظرہ سے تعبیر نہیں کرتے۔ کیونکہ یہ ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ جب تک دنیا میں فہم و فکر کے پیمانے مختلف رہیں گے۔ تبادل خیالات کی ضرورتوں کو برابر محسوس کیا جائے گا۔ کیونکہ رفع نزاع اور رفع اختلاف کی اور کوئی صورت بجز اس کے ہمارے ذہن میں نہیں آتی کہ دو معقول آدمی بیٹھ کر گفتگو سے معاملہ کو سلجھائیں یا باہمی افہام و تفہیم سے ایک دوسرے کو قائل معقول کر لیں۔

ہم جس چیز کی مخالفت کرتے ہیں اور جس بیماری کو اصابت فکر کے لئے مہلک سمجھتے ہیں وہ مناظرانہ ذہنیت ہے۔ مجادلہ بالاحسن تو وظیفۂ انبیاء ہے۔ یعنی ایسے طریق اور ڈھب سے اپنے مقصود کو پیش کرنا جو مخالف کے نقطۂ نظر سے بھی معیوب نہ ہو خالص پیغمبرانہ صفت ہے۔

ایک باریک اور حکیمانہ فرق مناظر اور داعی میں یہ ہے کہ مناظر کی زد میں صرف دلائل و اعتراضات کا ایک انبوہ ہوتا ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مخالف پر قابو پانے کے لئے ایک طرح کی اخلاقیت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن داعی دلائل کو اتنا اہم نہیں سمجھتا جتنا کہ اخلاقیت کو درخور اعتنا قرار دیتا ہے۔

یوں سمجھئے کہ مناظر کے سامنے صرف فن مناظرہ اور اس کے تقاضے ہوتے ہیں۔ وہ رشید یہ کے ہر ہر حرف کی پابندی کا التزام کرتا ہے۔ لیکن اس کتاب کو پڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جو اس کی لوح دل پر مرقوم ہے۔ اس کے برعکس ایک داعی یہ دیکھتا ہے کہ مخاطب میں رشد و ہدایت کے دواعی کیونکر بیدار ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ یہاں دلائل کے پیچھے بھاگنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا تو وہ نفس مخاطب کا تعاقب کرتا ہے اور نقض و معارضہ کی راہوں کو چھوڑ کر استدلال کی ایسی راہیں اختیار کرتا ہے۔ جو سیدھی اس کے دل تک پہنچتی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھئے کہ نمرود سے بحث کرتے وقت جب یہ دیکھتے ہیں کہ اس دلیل سے:۔

ربی الذی یحیی و یمیت

میرا پروردگار وہ ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اس کی تسکین نہیں ہوتی---------- تو اس دلیل پر اس کو جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کا ازالہ نہیں فرماتے۔ بلکہ آسانیٔ فہم کے لئے ایک اور مشاہدۂ عبرت اس کے سامنے پیش فرمادیتے ہیں۔ کہ اچھا یہ نہیں نہ سہی اس دلیل پر غور کرلو۔

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب

اللہ تو اپنی قدرت کاملہ سے آفتاب کو مشرق سے نکالتا ہے تم بھی اگر اس کارخانہ پر قابو رکھتے ہو تو یہ سمت بدل دو۔

ظاہر ہے دوسری دلیل پہلی دلیل سے کچھ قوی نہیں ہے۔ اور نہ پہلی دلیل ایسی غیر واضح ہے کہ اس پر نمرود کے اعتراض کو صحیح سمجھا جائے۔ تاہم حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مناظرہ کی منطق سے پہلو تہی کی اور تفہیم کا دوسرا انداز اختیار کیا۔ یہ بالکل وہی حقیقت ہے جسے قرآن "شہادت قلب" سے تعبیر کرتا ہے:۔

ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہ قلب اوالقی السمع وھو شھید

اس میں یقیناً نصیحت کی بات ہے ایک اس شخص کے لئے جس کے پہلو میں دل ہے یا جو توجہ سے سنتا ہے اور اس کا دل اس پر شاہد ہے۔

کیونکہ اگر پہلے ایک رائے قائم کرلی گئی ہے۔ تو پھر یہ ناممکن ہے کہ جانچ پرکھ کے اصولوں کا اعتدال کے ساتھ استعمال ہوسکے۔ نزاعی مسائل میں بالخصوص جب کسی فیصلہ پر پہنچنا مقصود ہو۔ ذہن کو اس تجریدی سطح پر لے آنا چاہیئے کہ گویا پہلی دفعہ آپ ایک موضوع پر غور کر رہے ہیں اور کوئی سابقہ تعصب یا پہلا عقیدہ آپ کے آزادانہ غور و فکر میں حائل نہیں۔

ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں:

طبیب ممکن ہے اس حقیقت کو نہ مانیں۔ مگر یہ ایک سچائی ہے کہ ہر دوا کا مزاج دوہرا ہوتا ہے۔ ایک مزاج وہ ہے جو دواؤں کے ساتھ ملانے سے ابھرتا ہے۔ یعنی بنفشہ کی ایک خصوصیات وہ ہیں جن کی وجہ سے وہ بنفشہ ہے۔ اور کچھ نئے اثرات اور نئی کیفیات ہیں جو دوسری دواؤں کے ساتھ ملنے سے اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ مفرد و مرکب کے مزاج و خصوصیات کا اختلاف اتنا واقعی اور حقیقی ہے کہ اس میں قطعاً اختلاف کی گنجائش نہیں۔ بسا اوقات مختلف ادویہ کو باہم ملانے اور آمیخت کرنے سے اس طرح کا ایک نیا مزاج پیدا ہو جاتا ہے اور نئی نئی خصوصیات ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ کہ خود طبیب حیران رہ جاتا ہے۔

طبعیات کی ایک مثال:

اس حقیقت کو زیادہ وضاحت سے سمجھنے کے لئے طبعیات کے اس عام مسئلہ پر غور کیجئے کہ آکسیجن اور ہائیڈروجن دو گیسیں ہیں۔ جن کو اگر علیحدہ علیحدہ دیکھا جائے تو کہیں نمی کا نشاں نہیں ملتا۔ یعنی اگر تجربہ یہ نہ بتلاوے کہ دونوں کے باہم ملنے سے پانی معرض ظہور میں آتا ہے تو صرف ان دونوں کا الگ الگ مطالعہ اس نتیجہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ دونوں کا مزاج اپنی طبعی خصوصیات کی وجہ سے پانی سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ یہ دونوں بہر آئینہ گیسیں ہیں۔ جن میں مائیت کی بجائے آتش پذیری کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں ہیں۔

مکانکی ثبوت:

اسی اصول کو مکانکی انداز سے دیکھئے کہ ایک مشین، ایک انجن اور کل پُرزوں کا بہت بڑا مجموعہ اس کا ایک وظیفہ ہے۔ اور وہ جن پُرزوں پر مشتمل ہے ان کا اپنا علیحدہ علیحدہ ایک کام ہے۔ اگر ایک شخص ریڈیو کے بکھرے ہوئے اجزاء کو دیکھے تو وہ کسی ایک پُرزے کو دیکھ کر یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا۔ کہ یہی جب دوسرے اجزاء سے مشین میں جڑے گا تو اس میں سے نغمہ و موسیقی کے چشمے ابلنے لگیں گے۔

بھاپ بظاہر کتنی ہلکی شے ہے۔ لیکن یہی ترتیب پا کر اور دوسرے کل پُرزوں سے مل کر بڑے بڑے انجنوں کو بجلی کی سی رفتار سے حرکت دیتی اور چلاتی ہے۔

حسن کی حقیقت:

جمالیات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے۔ یہاں بھی حسن کا مفہوم یہ نہیں کہ لذت نظر کا پورا پھیلاؤ جسم کے ایک ہی حصہ میں سمٹ آیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ ایک بالکل نئی حقیقت ہے جو مختلف حقیقتوں کے امتزاج و ترتیب سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی صرف کاکل و گیسو کا پیچ و خم ہی اسے معرض ظہور میں نہیں لاتا۔ بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ اس کا تعلق ایک حسین چہرہ سے بھی ہو۔ پھر وہ حسین چہرہ بھی تنہا کوئی شے نہیں جب تک ایک براق اور صراحی دار گردن نے اسے نہ تھام رکھا ہو۔ اور بات یہیں ختم نہیں ہوجاتی پھر اس گردن کو بھی اس طرح کا ہونا چاہیئے کہ جب نظر اس سے پھسلے تو ایسی جگہ جا کر رکے کہ اس رکاوٹ کے بعد دنیا کی اور کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ پھر نظر اور خیال کی یہ بھی کوئی آخری رکاوٹ نہیں۔ اور کئی چیزیں ہیں جو نظر کے دامن کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، مسکراہٹیں ہیں، انگڑائیاں ہیں، چال ہے، ادائیں ہیں اور خدا جانے کیا کچھ ہے؟ غرض یہ ہے کہ ان میں ایک ایک چیز کا علیحدہ علیحدہ اگر آپ تصور کریں گے تو ان میں کوئی کشش اور جاذبیت نظر نہیں آئے گی۔ لیکن جب ان سب کی مجموعی فوج تیار ہوگی۔ تب فتوحات کی وسعتوں کے کیا کہنے۔

یہ حسن جو نغمہ و شعر میں مضمر ہے کہاں سے آیا ہے۔ محض حسن امتزاج ہی تو ہے۔ ایک عمدہ سے عمدہ شعر جو آپ کو تڑپا دیتا ہے اور وجد طاری کر دیتا ہے۔ وہ جن الفاظ اور تراکیب پر مشتمل ہوتا ہے ان کو الگ الگ ہزاروں مرتبہ ہم پڑھتے اور دیکھتے ہیں۔ لیکن ہمارا ذہن کبھی متاثر نہیں ہوتا۔ پھر جب ایک صاحب فن ان الفاظ کو لے کر سلیقے سے ترتیب دیتا ہے تو اس میں بالکل نئی معنویت پیدا ہوجاتی ہے۔ جو پہلے نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ حقیقت ہے کہ اگر ہمارا سائنس اتنی ترقی کر لے کہ وہ نغمہ کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ کر سکے تو وہ آپ کو یہ بتا سکے گا کہ وہ راگ جو آپ کے لئے لذتِ گوش کا سامان بہم پہنچاتا ہے درحقیقت ایسی آوازوں کا مجموعہ ہے کہ جن کو اگر آپ الگ الگ سن پائیں تو بے توجہی یا نفرت سے منہ پھیر لیں۔

استدلال و استنباط کا معاملہ:

غرض یہ ہے کہ ہر شے کے دو مزاج ہوتے ہیں۔ ایک جب وہ تنہا ہو اور ایک جب وہ دوسری چیزوں کے ساتھ ملے۔ ٹھیک اسی طرح فکر و استدلال کا معاملہ ہے۔ یہاں بھی ایک حقیقت یا مفہوم وہ ہے جو ایک آیت یا ایک

حدیث میں منفرد آمذ کور ہے اور ایک اس کی وہ جامع اور واضح شکل ہے جو کتاب و سنت کے دفاتر و ابواب میں مختلف پہلو اور پیرایہ ہائے بیان میں مستور ہے۔ ان دونوں میں وضاحت و تعیین کا جو فرق ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔

یہ قطعی ممکن نہیں کہ ایک مسئلہ اپنے طبعی پھیلاؤ کے ساتھ کسی ایک جگہ اس انداز سے آجائے کہ کوئی پہلو اجمال کا اس میں نہ رہے۔ یا کوئی غلط تاویل نہ پیدا ہوسکے۔ یا کسی شک وظن کی گنجائش نہ نکل سکے۔ بلکہ اس کے برعکس قرآن و حدیث کا مسائل کے باب میں یہ انداز خاص ہے جو بالکل فطرت انسانی کے مطابق ہے کہ ایک مقام پر صرف انہیں حقیقتوں کا اظہار ہو جن کا اظہار وہاں مقصود ہے۔ قرآن و سنت کا انداز بیان فقہ و قانون یا انسانی فنون سے مختلف ہے۔ کیونکہ ان کے پیش نظر صرف چند اصول ہی نہیں جن کو سمجھانا مقصود ہے۔ پوری انسانی زندگی ہے۔ پورا معاشرہ ہے۔ زمانہ کا ایک مخصوص ذہن ہے۔ وقت کے رسم و رواج اور تصورات و عقائد ہیں۔ آں حضرت ﷺ مکلف ہیں کہ ایک خاص تدریج اور ترتیب سے ان تمام اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائیں اور خاص ڈھب سے ان کی ترتیب فرمائیں۔ اس لئے وہاں ترتیب مسائل کا وہ ڈھب قدرتاً نہیں ہوسکتا جو ہم کو فنون کی کتابوں میں ملتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے صرف فن اور اس کے متعلقات ہیں اور آں حضرت ﷺ کے سامنے ایک قوم ہے جس کی اصلاح کی ایک خاص رفتار ہے اس لئے قرآن و سنت کی ہدایات و نصوص اس تاریخی رفتار کے دوش بدوش چلتے ہیں۔

ایک نکتہ:

یہی وہ نکتہ ہے جس پر نظر نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں نے قرآن حکیم میں ازراہ تکلف ربط آیات کی تلاش شروع کر دی اور قرآن کو بھی ایک انسانی کتاب بنانا چاہا۔ جس میں ترتیب بیان کا وہی انسانی ڈھنگ ہے۔ گویا وہ بھی ایک فن ہے اور اس میں بھی وہی ترتیب و ربط ہے جو فن کی دوسری کتابوں میں ہوتا ہے۔ حالانکہ کتاب و سنت ایک قوم کی ترتیب کا عملی و علمی ریکارڈ ہے۔ اس میں جو ترتیب ہے وہ تاریخی ہے۔ واقعات کی ہے۔ مسائل و مضامین کی ہے اس انداز کی نہیں کہ آپ ایک ایک آیت کو ماقبل سے متصل اور جڑا ہوا پائیں۔

دوسرا مقدمہ:

اس لئے قدرتاً دوسرا مقدمہ یا اصول فہم مسائل جس کا مرعی رکھنا ضروری ہے یہ ہوگا کہ جب کسی مسئلہ پر غور کریں بشرطیکہ وہ مسئلہ اہم اور بنیادی بھی ہو تو اس کے پورے متعلقات کو بیک وقت زیر نظر لائیں۔ کتاب و سنت میں تفحص اور تلاش سے ایسے مقامات مل کر ایسی مکمل اور جامع اور ایسی واضح اور روشن تصویر آپ کے سامنے پیش کریں گے کہ اتنی وضاحت و جامعیت سے وہ کسی ایک جگہ نہیں مل سکے گی۔ یعنی دلائل و مویدات کے پورے پھیلاؤ کو پہلے اپنے سامنے لائیے۔ پھر یہ دیکھئے کہ اب آپ کے تاثرات کیا ہیں؟ یقیناً اس طرح کا یہ تاثر اس تاثر سے بالکل مختلف ہوگا۔ جو اس ترتیب کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ یوں ایک شبہ جو ایک جگہ ابھرتا ہے۔ دوسری جگہ زائل ہوجائیگا۔ یعنی اگر ایک مخصوص وضاحت ایک آیت میں آپ کو نہیں ملے گی تو وہ دوسرے انداز سے دوسری جگہ مل جائے گی یہی حال احادیث کا ہے کہ ان کو ساتھ ساتھ رکھنے سے شک و شبہ کی تمام گنجائشیں ختم ہوجاتی ہیں۔

ایسی صورت میں مسئلہ کی لغوی اور ادبی تصریحات کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہے گی۔ اور

یفسر بعضہ بعضاً

کا وہ منظر آپ کے سامنے آئے گا کہ جس سے کامل انشراح صدر کے مواقع ملیں گے۔

اس سلسلہ میں مناظروں کا عامتہ الورود دھوکہ یا گھپلا یہ ہوتا ہے کہ اس تاثر کو وہ زائل کریں جو تصویر کے پورے رخوں کو دیکھنے سے پیدا ہوا ہے۔ یعنی ایک ڈاکو کی طرح جو بھیڑ اور ہجوم سے بچتا ہے اور اکے دکے مسافر پر حملہ کرتا ہے۔ یہ صرف ایک ایک آیت کو، بحث کے لئے چنتے ہیں۔ اور ایک ایک حدیث کو مجموعی تاثر سے الگ کر کے حملہ آور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن میں چونکہ مسئلہ کے تمام پہلو نہیں رہتے اس لئے کمزور عقل اور تھوڑے علم کا آدمی آسانی سے ان کی تاویلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

تیسرا اصول:

فکر و استدلال کی گاڑی کو کامیابی کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے اس مقدمہ کی رعایت بھی ضروری ہے کہ دعوے اور دلائل میں خصوص و تعیین کی مناسبت کا خیال رہے۔ یعنی جس درجہ دعوے میں تعیین اور تحدید ہے اسی طرح دلیل کو بھی متعین و خاص (SPECIFIC) ہونا چاہیئے۔ ورنہ یہ اندیشہ لاحق رہے گا کہ مدعی و مجیب دونوں اپنی اپنی ہانکتے رہیں اور تنقیح طلب لکات بدستور تشنہ ہی رہیں۔

فکر و استدلال کی عام لغزش:

روداد مناظرات میں یہ مغالطہ عام ہے۔ ہر مناظر دعویٰ تو کرتا ہے ایک لگے بندھے اور بنے تلے عقیدے کا، اور دلائل ایسے پیش کرتا ہے کہ جن کے مزاج میں عموم تو ہوتا ہے مگر وہ کلیت نہیں ہوتی۔ ہر ہر فرد پر جس کا اطلاق بلا محابہ ہو سکے اور نہ وہ تعیین و خصوص ہی ہوتا ہے کہ جس سے دعویٰ ثابت ہو سکے۔ موضوع زیر بحث میں جہاں جہاں اس انداز کے دھوکے اور گھپلے آئے ہیں۔ میں ان کی چہرہ کشائی نہیں کروں گا۔ کیونکہ ان کی وضاحت تو اپنے مناسب مقام پر ہو گی۔ سر دست دوسری طرح کی مثالوں سے اس کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

ایک مثال:

متحدہ ہندوستان میں دو سیاسی تنظیمیں ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے لئے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ایک کانگرس تھی جس میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ پیش پیش تھے اور دوسری جانب مسلم لیگ تھی جس کی عنان قیادت بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کے ہاتھ میں تھی۔ مولانا کے حامی یہ کہتے تھے کہ انگریزی دان حضرات کو اسلامی مزاج سے کیا مناسبت؟ اور لیگ سے وابستہ اس الزام کا یوں جواب دیتے تھے کہ یہ مانا، ابوالکلام آزاد بڑا دقیقہ رس عالم ہے مگر سیاسیات کا خارزار ہے۔ یہ قال اللہ وقال الرسول کہنے والے کیا جانیں کہ یہاں کن کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے؟

استدلال کی غلطی دونوں جانب یہ تھی کہ یہ بحث کرنے والے یہ بھول جاتے تھے کہ متنازع فیہ کوئی عالم دین نہیں بلکہ ابوالکلام ہے جس کی جامعیت اور سیاسیات میں بصیرت کو روسوخ کالوہا بڑوں بڑوں نے مانا ہے۔ اسی طرح

سوال صرف کسی مسٹر کا نہیں۔ محمد علی جناح کا ہے جو ہوسکتا ہے دین کی جزئیات کو اتنا نہ جانتا ہو جتنا ایک عالم دین جانتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے اس کی شبانہ روز کی زندگی کا معمول اس انداز سے مختلف ہو جو عام مسلمان کا ہوسکتا ہے۔ لیکن اتنا تو بہر آئینہ مسلم ہے کہ اس کی دعوت کی بنیاد دو قوموں کے جس عقیدہ پر تھی وہ عین اسلامی انفرادیت کا تقاضا تھا۔

غرض یہ نہیں کہ دونوں کو حق بجانب ٹھہرایا جائے یا دونوں کی غلطی پکڑی جائے۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ دونوں گروہوں کے طرز استدلال میں جو منطقی غلطی تھی۔ وہ یہی تھی۔ کہ ان کا دعویٰ تو مخصوص اور متعین تھا لیکن دلیل کی بناوٹ میں عموم کو زیادہ دخل تھا۔ یعنی ثابت وہ یہ کرنا چاہتے تھے کہ ابوالکلام علم و فضل کی جلالت شان کے باوجود سیاسیات میں کورے ہیں اور دلیل وہ یہ لاتے تھے کہ عام علماء کے دائرہ معلومات میں سیاسیات کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوتی اسی طرح دوسرا فریق جواباً کوشش یہ کرتا تھا کہ بانیٔ پاکستان کی دین سے متعلق عام لاعلمی کا غلط استعمال کرے۔ حالانکہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ اگر کسی شخص نے اسلامی فنون کو نہیں پڑھا۔ تو وہ اسلام کے متعلق ایک بدیہی اور جانی پہچانی حقیقت سے بھی ناواقف ہے۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اسلام ایک الگ ثقافت ہے اور اسلامی قومیت کی بنیاد علیحدہ اور ممتاز عقیدے کی نیو پر استوار ہوتی ہے۔

اب یہ الگ بحث طلب اور دقیق مسئلہ ہے کہ اسلامی قومیت کا دائرہ کسی دوسرے ثقافتی و وطنی دائرے سے بھی کہیں ملتا ہے یا نہیں یا اس کے ملنے اور الگ رہنے کی کیا کیا صورتیں ہیں؟ یہاں اس گتھی کو سلجھانے کا کوئی موقع نہیں۔ غرض یہ ہے کہ فریقین نے اثبات مدعا کے لئے جو ڈھنگ استعمال کیا اس میں کیا منطقی خامی تھی۔

دوسری مثال:

اسی طرح ایک گھپلا وہ ہے جو عام الحاد پسند عناصر کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے کہ اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ دلیل کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مذہب کی نظر میں چونکہ مادیت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ بلکہ اصلی و حقیقی شئے روحانیت ہے اس لئے وہ دنیا قدروں سے بحث ہی نہیں کرتا۔ یہی نہیں بلکہ وہ طبائع کو ایسے رخ پر ڈالتا ہے کہ جو تعمیر و تمدن کے یکسر منافی ہوتا ہے یعنی ایک مذہبی آدمی کی نفسیات اس طرح کی ہوجاتی ہیں کہ وہ آخرت کو اتنا اہم سمجھتا ہے کہ یہاں کی ہر ہر لذت اس کی نظروں میں حقیر ٹھہرتی ہے۔ وہ بھوک کی ہر تکلیف اور جھانجھ کو اس توقع پر برداشت کرلیتا ہے۔ اور اس کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتا کہ آسمانی بادشاہت میں جو نعمتیں اس کے دستر خوان پر چنی جائیں گی وہ ان سے کہیں عمدہ ہونگی۔ اس کی ساری کوشش اس امر پر مرکوز رہتی ہے کہ کسی طرح یہ نفس امارہ ختم ہوجائے۔ اگرچہ اسکے ختم ہونے سے زندگی کی یہ ساری آرزوئیں ہی کیوں نہ مٹ جائیں۔ اس کا ذہنی برتاؤ دنیا کے بارے میں ہمدردانہ نہیں ہوتا۔

ظاہر ہے مذہب کے باب میں یہ تجزیہ عیسائیت اور ہندو مذاہب کے اعتبار سے تو صحیح ہے کہ ان کے ہاں رہبانیت اور تیاگ بنیادی عقیدہ ہے۔ ہندو مذہب کے نقطہ نظر سے یہ ساری کائنات متوہم یا باطل ہے اس لئے اس کے تقاضے اور مطالبے بھی درخور اعتناء نہیں ہوسکتے۔ اسی طرح عیسائیت کے خیال سے اصلی و حقیقی زندگی صرف وہ

ہے جس کا آغاز موت کے بعد ہوگا۔ دنیاوی اور جسمانی زندگی کو وہ یک قلم گناہ اور معصیت کی زندگی قرار دیتے ہیں اسی لئے نجات کے لئے وہ ان اعمال پر بھروسہ نہیں کرتے جو اس جسم کے ساتھ اس دنیا میں رونما ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ عمل جو جسم کی آلودگیوں سے کسی طرح الگ نہیں ہے پاک کیونکر ٹھہرے گا۔ ان کے نزدیک نجات کا انحصار اعمال پر نہیں کفارہ پر ہے۔ لیکن اسلام کا مزاج اس ذہنیت سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تو موت سے پہلے کی زندگی میں اور آخرت و عقبیٰ کی زندگی میں کوئی خط امتیاز نہیں کھنیچتا۔ بلکہ اس کے نزدیک تو یہ پہلی زندگی دوسری زندگی کی تمہید یا نتیجہ ہے۔ اسلام جس عقیدے کی تلقین کرتا ہے وہ یہ ہے کہ دنیا اگرچہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹھہراؤ کی جگہ نہیں تاہم اسکے فرائض و واجبات میں جن سے ادنیٰ تغافل بھی رہبانیت ہے۔ یہاں رہنے اور بسنے کے کچھ شرائط ہیں جن کو بہر آئینہ ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اسلام تمدنی ارتقاء میں پورا پورا حصہ دار ہے۔ ایک مسلمان کی بہترین آرزو اس کے نزدیک یہی ہے کہ وہ "وقنا عذاب النار" سے پہلے حسن دنیا کا طالب ہو کہ عروس دنیا کے گیسوئے پیچیدہ کو اگر سلجھالیا گیا تو آخرت کا مسئلہ آسان ہے۔

جسم ناپاک نہیں۔ یہ دنیا اور اس کی فطرت بھی گناہ و معصیت سے آلودہ نہیں بلکہ ارادہ و شعور اور عمل کے خاص خاص نقشے یا چوکھٹے اسے ناپاک یا پاک ٹھہراتے ہیں۔ غرضیکہ جب اسلام کا معاملہ دوسروں سے مختلف ہو تو اسے منجملہ دوسرے مذاہب کے ایک مذہب قرار دینا اور پھر ترقی کی راہ میں مانع سمجھنا منطقی غلطی ہے۔

تنبیہ کی ضرورت:

یہ اصول منطق میں نہایت پیش پا افتادہ ہے کہ جب دعویٰ خاص ہو تو اس کے ثبوت میں دلیل کو بھی خاص اور متعین ہونا چاہیئے۔ لیکن اگر آپ مباحثات کا جائزہ لیں گے تو وہ دینی ہوں یا سیاسی ان میں اسی مغالطہ کو زیادہ جاری و ساری پائے گا کہ دعویٰ و دلیل میں باہم مناسبت نہیں۔ ایک کا مزاج متعین ہے اور دوسرا غیر متعین۔ عموم کا رنگ لئے ہوئے۔ اس لئے اس پر تنبیہ ضروری تھی۔

خلاصہ بحث:

اب تک جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا ملخص یہ ہے کہ مسائل کے فہم کے لئے سب سے پہلے ذہن کا صاف ہونا ضروری ہے۔ بالخصوص مناظرانہ کج بحثی سے جو غور و فکر کی صلاحیتوں میں ایک طرح کا بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور تنگ نظری اور چھچھورپن سے جو اس کا منطقی نتیجہ ہیں بچاؤ لازمی ہے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ کسی مسئلہ پر غور کرتے وقت ایک مرتبہ اس کے مجموعی چوکھٹے پر نظر ڈال لی جائے کہ دلائل و شواہد کے اس انبار سے خود بخود کیا اثرات ذہن پر مرتسم ہوتے ہیں اور دلائل کی چھان بین میں اس لغزش پر خصوصیت سے نظر رہے کہ دعوے و دلیل میں باہم تطابق بھی ہے یا نہیں۔